محمد جعفر پھلواروی

# توحید و شرک

ایک مسلمان کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ اسلام کا سب سے بڑا بنیادی پتھر توحید ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں قدم قدم پر توحید کا اثبات اور توحید کی ضد یعنی شرک کی نفی کی گئی ہے۔ امر سے، نہی سے، قصص سے، وعظ و تذکیر سے، امثال سے غرض جن جن راستوں سے توحید کا اثبات ہو سکتا ہے اور جن جن طریقوں سے شرک کی نفی ہو سکتی ہے وہ سب قرآن نے اختیار فرمائے ہیں۔

یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ وحدت ربانی کا مطلب محض اتنا نہیں کہ اللہ کو ایک عدد مان لیا جائے۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو تمام مشرکین عرب موحد قرار دیئے جاتے۔ اس لئے کہ انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ اللہ دو یا زیادہ ہے۔ پورے لغت عرب میں لفظ اللہ کا کوئی تثنیہ یا جمع نہیں۔ علاوہ ازیں کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا یہ ترجمہ بھی نہیں کہ اللہ ایک عدد ہے اس کلمے کے معنی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے" اللہ ایک ہے" کے لئے اللہ احد کے الفاظ ہیں اگرچہ اللہ کو ایک عدد ماننا بھی توحید ہی کا ایک حصہ ہے۔ لیکن محض اتنے سے اقرار سے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار نہیں ہوتا۔ زبان رسالت میں جس اقرار کا ذکر ہے وہ یوں ہے کہ، من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ یعنی جو لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہوگا۔ وہ جنتی ہوگا۔ آنحضورؐ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ، من قال اللہ احد دخل الجنۃ (کہ جو یہ اقرار کرے کہ اللہ ایک عدد ہے وہ جنتی ہوگا۔) اللہ احد کے قائل تو تمام مشرکین عرب تھے۔ پھر وہ مشرک کس طرح ہو گئے؟ معاملہ صرف عدد کا ہی نہیں بلکہ مشرکین عرب تو اس کے بھی قائل تھے کہ تمام تصرفات اور قدرتوں کا مالک اللہ ہی ہے

قرآن مجید اس حقیقت کو یوں بیان فرماتا ہے :۔

۱ ۔ ولئن سالتھم من خلقھم لیقولن اللہ ۔ ۔ ۔ ۴۳/۸۷

اگر ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ یہی اقرار کریں گے کہ اللہ نے کیا ہے

۲ ولئن سألتھم من خلق السموٰت والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللہ ۔ ۔ ۔ ۲۹/۶۱

اگر ان سے دریافت کرو کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کس نے کیا۔ اور کس نے شمس و قمر کو مسخر کیا۔ تو وہ یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے کیا ہے ۔

۳ ۔ ولئن سألتھم من نزل من السماء ماء فاحیا بہ الارض من بعد موتھا لیقولن اللہ ۲۹/۶۳

اگر تم ان سے سوال کرو کہ کون آسمان سے پانی برسا کر زمین کو مردہ ہو چکنے کے بعد زندہ کرتا ہے ۔ تو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ کرتا ہے ۔

یہ تو چند نظائر ہیں جن میں مشرکین کا یہ اقرار موجود ہے کہ خالق و رازق اللہ ہی ہے اور قرآن میں مشرکوں کا یہ قول کسی آیت میں نہیں کہ فلاں قدرت و اختیار اللہ کے پاس نہیں۔

ان آیات کی روشنی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مشرکین عرب اللہ کو ایک مانتے ہیں۔ اور تمام قدرتوں کا مالک بھی سمجھتے ہیں تو یہ مشرک کیوں قرار دیئے گئے ۔؟ یہ سوال بڑا اہم ہے ۔ اور آسانی سے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ اس سوال کا جواب کچھ مشکل نہیں ۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ اگرچہ اللہ کو واحد اور تمام قدرتوں اور تصرفات کا مالک بھی سمجھتے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ انہوں نے یہ اضافہ بھی کر لیا تھا کہ اللہ کے ماتحت کچھ اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں جن کو کم درجے کی قدرتیں حاصل ہیں ۔ یہ سب اللہ سے چھوٹے اور کمتر ہیں ۔ اور قدرتیں بھی کم رکھتے ہیں ۔ لیکن یہ بہر حال کچھ قدرتیں رکھتے ہیں ۔ اور ہماری پکار کو سنتے ہیں ۔ گویا اللہ تعالیٰ نے مختلف ڈیپارٹمنٹ بنا دیئے ہیں ۔ اور ان خداؤں کو ان کا افسر اعلیٰ بنا دیا ہے ۔ کہ ان کے پاس درخواستیں جاتی ہیں ۔ اور وہ آگے اللہ کو اس طرح فارورڈ کر دیتے ہیں ۔ کہ یہ درخواست منظور ہونی چاہیئے اور یہ درخواست ریجکٹ کر دینی چاہیئے ـــــ چنانچہ ان خداؤں کی عبادت کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ :۔ ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ ۔ یعنی ہم ان کی عبادت محض اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں گے ۔ گویا ان کے "توسل" کے بغیر ہم براہ راست اللہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے ـــــ لہٰذا درخواست

دینی ہو یا دعا کرنی ہو۔ یا مدد کے لئے پکارنا ہو تو پہلے ان کو پکارے۔ کیونکہ ایک معبود محکمۂ اولاد کا افسر اعلیٰ ہے۔ دوسرا نوکری دلواتا ہے۔ تیسرا مقدمہ جتواتا ہے۔ اور چوتھا عشق و محبت میں کامیاب کرا دیتا ہے۔ وَھَلُمَّ جَرًّا

اور ہاں ذرا یہ بھی دیکھئے کہ انہیں خدا کو پکارنے سے انکار نہ تھا بلکہ خاص وقتوں میں یہ اللہ ہی کو پکارتے تھے۔ قرآن اس حقیقت کی یوں شہادت دیتا ہے :-

هو الذی یسیرکم فی البر والبحر حتی اذا کنتم فی الفلک وجرین بهم بریح طیبة وفرحوا بها جاءتها ریح عاصف وجاءهم الموج من کل مکان وظنوا انهم احیط بهم دعوا الله مخلصین له الدین لئن انجیتنا من هذه لنکونن من الشکرین ۱۰/۲۲

(یہ مضمون ۲۹/۶۵ میں بھی بیان ہوا ہے)

وہی اللہ ہے جو تمہیں خشکی و تری میں سیر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو۔ اور ان (سواروں) کو خوشگوار ہوا کے ساتھ لے کر وہ چلتی ہیں۔ اور وہ خوش ہونے لگتے ہیں تو ایک تند ہوا آتی ہے۔ اور ہر جانب سے موجیں آنے لگتی ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ اب وہ گھر گئے تو پھر اللہ کو دینی اخلاص کے ساتھ پکارتے ہیں کہ اے اللہ! اگر تو ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا دے تو ہم شکر گزار بندے بن جائیں گے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا؛ ان مشرکین پر بھی ایسا وقت آتا تھا۔ جب وہ خالص اللہ کو ہی پکارتے تھے۔ یعنی اپنی عام (نارمل) زندگی میں تو وہ باطل معبودوں کو پکارتے تھے۔ لیکن جب سب دروازے بند ہوتے نظر آتے تو عین مصیبت میں صرف اللہ ہی سے مدد مانگتے تھے۔ آگے چلنے سے پہلے ذرا اپنی قوم کا بھی جائزہ لے لیجئے۔ ہماری قوم کے بہت سے عوام اپنی نارمل زندگی میں تو خدا ہی سے امداد و اعانت طلب کرتے ہیں۔ اور ہر نماز میں حصر کے ساتھ ایاک نعبد وایاک نستعین کی تکرار کرتے ہیں۔ لیکن جب کوئی سخت مصیبت کا وقت آتا ہے۔ تو ایاک نستعین کے انکار کے ساتھ خدا جانے کن کن بزرگوں کو پکارتے ہیں۔ کہیں یا پیر المدد کی صدا ہے اور کہیں یا فلاں شیئاً للہ کہیں فلاں مدد سے اور کہیں فلاں اغثنی ـــ یعنی وہاں عین موجوں میں گھِر کر اللہ سے استعانت ہے اور یہاں گرداب حوادث میں پھنس کر غیر اللہ سے فریاد۔ اور اس کے باوجود وہ بدبخت مشرک ہیں۔ اور ہم پکے موحد۔

اس سے زیادہ دلچسپ چیز نوده نماز ہے جسے صلوٰۃ الاسرار یا نماز غوثیہ کہتے ہیں۔ اسے بھی مع ترکیب استعمال سن لیجیے۔

تمام مراد و مقاصد کے لئے یہ نماز نہایت مجرب ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ بعد نماز مغرب سنتیں پڑھ کر دو رکعت نماز نفل پڑھیں۔ اور بہتر یہ ہے کہ ہر رکعت میں الحمد کے بعد گیارہ گیارہ بار قل ہو اللہ پڑھیں۔ سلام کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر گیارہ بار درود و سلام عرض کر کے یہ کہیں یا رسول اللہ یا نبی اللہ، اغثنی وامددنی فی قضاء حاجتی یا قاضی الحاجات۔ پھر عراق کی طرف گیارہ قدم چلیں اور ہر قدم پر کہیں یا غوث الثقلین یا کریم الطرفین اغثنی وامددنی فی قضاء حاجتی یا قاضی الحاجات پھر حضور کے توسل سے جناب باری میں دعا کریں (بہجۃ الاسرار)

اس کے علاوہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس نماز کو حضور غوث پاک سے نقل کیا ہے ——— "اسلامی تعلیم" مولفہ مولانا سید محمود مفتی اعظم الوری صفحہ ۲۸

غور کرنے کے باوجود یہ گورکھ دھندا میری سمجھ میں نہ آسکا۔ اس عبارت پر جو شکوک وارد ہو سکتے ہیں وہ یوں ہیں۔

۱ ۔ کن لوگوں کا مجرب ہے؟ اور کیا محض تجربے کو دین کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور کیا غیر مسلموں کے اس تجربے کو بھی مان لینا چاہیے کہ کالی مائی، لکشمی دیوی اور مسیح کو پکارنے سے مراد پوری ہوتی ہے؟

۲ ۔ یہ بڑا احسان ہے کہ ایک ہی بار سہی مگر اس وظیفے میں خدا کی حمد و ثنا کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اور گیارہ بار درود و سلام کو بھی داخل کر لیا گیا ہے۔

۳ ۔ درود و سلام کے بعد کے الفاظ میں یا قاضی الحاجات سے کون مراد ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیونکہ حضور ہی کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔

۴ ۔ یہ کہتے ہوئے مدینے کی طرف رخ کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اگلی فریاد کرتے وقت عراق (بغداد شریف) کی طرف رخ کر لینا اس "نماز یا وظیفے کا جزو اعظم ہے کعبے کی طرف منہ کی بھی ضرورت نہیں۔ مگر بغداد شریف کی طرف رخ کرنا، رخ کر کے گیارہ قدم چلنا، اور ہر قدم پر مذکورہ الفاظ فریاد ادا کرنا لازمی جزو وظیفہ ہے۔ یعنی رسول اللہ کو صرف ایک بار پکارنا کافی ہے۔ اور حضرت "غوث پاک" کو رو بہ قبلہ نہیں۔ بلکہ رو بہ بغداد ہو کر گیارہ قدم چل کر ہر ہر قدم پر ایک ایک

بار پکارنا ضروری ہے۔

۵ - پھر یہاں بھی یا قاضی الحاجات کا لفظ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد "غوث پاک" ہی ہیں۔ گویا تین قاضی الحاجات ہوئے۔ ایک تو اللہ (جسے اس وظیفے میں کہیں اس لفظ سے مخاطب ہی نہیں کیا گیا ہے) دوسرے سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ تیسرے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح

۶ - کیا واقعۃً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح نے لوگوں کو یہ طریقہ نماز بتایا ہوگا؟ کیا آپ رح کو خود کوئی ضرورت نہ پڑتی ہوگی؟ اس وقت آپ غوث الثقلین اور کریم الطرفین کو (یعنے اپنے آپ کو) پکارتے تھے۔ یا اللہ تعالیٰ کو؟ اور یہی سوال خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضور اللہ کو پکارتے تھے یا اپنے آپ کو؟ اور کیا آنحضرت نے بھی اپنی امت کو ایسی کوئی تعلیم دی ہے کہ مصیبت میں مجھے پکارا کرو یا میرے بعد ایک آنے والے بزرگ (شاہ جیلانی) سے مدد مانگا کرو۔؟

۷ - کیا شیخ عبدالحق محدث دہلوی یا ملا علی قاری کی نقل کردہ ہر روایت کو صرف اس لئے بالاتر از تنقید یا واجب العمل سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ حضرات ہم سے زیادہ اسلام کو سمجھتے تھے۔ اور ہم سے زیادہ لکھے پڑھے اور زیادہ متقی و پرہیزگار تھے؟ کیا ہم بروز حشر یہ عذر پیش کر کے چھٹکارا حاصل کر سکیں گے کہ اطعنا سادتنا وکبرائنا (ہم نے تو اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی تھی)؟ اور کیا اپنے پیش رو قابل قدر بزرگوں کی اندھی تقلید غیر مسلموں کے اس جواب سے مختلف ہے کہ وجدنا علیہ اباءنا ۔ ۔ ۔ ۔ الفینا علیہ اباءنا؟

ایک طرف قرآن کی واضح تعلیم ہے (ایاک نعبد و ایاک نستعین) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر مشکوک عمل ہے اور تعلیم بھی۔ اور دوسری طرف یہ وظائف ہیں جو شکوک سے خالی نہیں۔ فیصلہ ہر منصف مزاج کو خود کر لینا چاہیئے۔ فیصلہ کرتے وقت یہ آیت پیش نظر رکھنی چاہیئے۔ (واذا ذکر اللہ وحدہ اشمازت قلوب الذین لا یومنون بالاخرۃ، واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون ۳۹/۴۵) یعنی جب صرف اللہ کو یاد کیا جائے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے دل بھینچنے لگتے ہیں۔ مگر جب ان لوگوں کا ذکر ہو جو اللہ کے علاوہ ہیں تو بڑے خوش ہونے لگتے ہیں —— اس آیت پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے کہ کہیں ہماری حالت اس کے مضمون سے ملتی جلتی تو نہیں؟ عام یادِ خدا اور ذکر اللہ تو الگ رہا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ اگر صرف خدا سے دعا کی جائے تو پوری تسکین

نہیں ہوتی۔ اور جب مذکورہ بالا قسم کے اوراد بتائے جائیں تو ہم اسے علم سینہ بسینہ سمجھ کر خوشی خوشی سینے سے لگا بیٹھتے ہیں اور یہ یقین ہو جاتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اب تو ضروری ہماری دعا قبول ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ مجرب عمل ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ کوئی روح، کوئی جن، کوئی فرشتہ مدد نہیں کر سکتا۔ یہ کیا ایک جانور اور ایک بے جان شے بھی مدد کر سکتی ہے۔ سوال یہاں مدد کر سکنے کا نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ ہمیں مدد کے لئے کس کو پکارنے کا حکم ہے۔؟ ہماری تحقیق یہ ہے کہ صرف خدا ہی کو پکارنا چاہیئے۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ خواہ کسی روح کو بھیج دے، کسی جن یا فرشتے سے مدد کرا دے، کسی جانور یا جمادات کو ذریعۂ اعانت بنائے یا کوئی ایسا ذریعہ بنائے جس کا ہمیں علم بھی نہ ہو سکے۔ وہ جو بھی چاہے اور جو مناسب سمجھے کرے۔ اس سے ہمیں بحث نہیں۔ یہ اس کا کام ہے اور ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس سے صرف اس سے مدد چاہیں۔ تجربہ کچھ بھی ہو اسے درمیان میں لانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پیش نظر صرف فرمانِ الٰہی ہونا چاہیئے کہ ادعونی استجب لکم (مجھے پکارو میں قبول کروں گا) اور ہمارے سامنے یہ تعلیم ہونی چاہیئے کہ ایاک نعبد و ایاک نستعین (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے اعانت کی درخواست کرتے ہیں)

تجربہ تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیقؓ کی مدد ایک مکڑی نے کی۔ یعنی دہانۂ غار پہ جالا تان دیا اور دشمنوں کی عقل پہ پردہ پڑ گیا۔ یہ سب کچھ صحیح ہے۔ لیکن ہمیں اس کا حق نہیں۔ اور نہ اس کی اجازت دی گئی ہے کہ مکڑی سے یہ کہہ کر مدد مانگی جائے کہ تو نے رسولؐ و صدیقؓ کی مدد کی تھی۔ اس لئے ہماری بھی مدد کر۔

اور ناقابلِ انکار مدد تو یہ ہے جس کا دو جگہ قرآن پاک میں یوں ذکر ہے:۔

۱۔ اذ تقول للمومنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثۃ الاف من الملئکۃ منزلین ○ بلی ان تصبروا وتتقوا ویاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسۃ الاف من الملئکۃ مسومین ○ ۳/۱۲۴

یاد کرو اے رسول! جب تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار فرشتوں کو نازل کر کے تمہاری مدد کرے۔ ہاں اگر تم صبر و تقویٰ سے کام لو۔ اور وہ دشمن اچانک تم پر حملہ آور ہوں۔ تو اللہ پانچ ہزار ایسے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا جو داغ لگانے والے ہوں گے۔

۲۔ اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملئکۃ مردفین ○ ۸/۹

یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے۔ تو اس نے تمہاری فریاد سن کر یہ جواب دیا کہ میں پے در پے ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا۔

یعنی فرشتوں کی مدد منصوص اور ناقابلِ انکار قرآنی شہادت ہے اور جناب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدد نہ نصِ قرآنی ہے نہ حدیث۔ صرف ایک تجربہ ہے ——— اس طرح کا تجربہ جس طرح ایک عیسائی کو مسیح علیہ السلام سے یا ایک ہندو کو کرشن جی سے مدد مانگنے کا تجربہ ہوتا ہے ——— یا کسی کا کشف ہے جو بمقابلہ قرآن یقیناً قابلِ قبول نہیں۔ یا پھر ایک ایسی روایت ہے جو صریح اسلامی تعلیمات کے منافی ہونے کی وجہ سے قابلِ رد ہے۔ لوگ جب رسول کی طرف جھوٹی روائتیں منسوب کر سکتے ہیں تو حضرت شیخ جیلانیؒ کی طرف کوئی روایت بنا کر منسوب کرنے میں کیا باک ہو سکتی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جب فرشتوں کی مدد منصوص ہونے کے باوجود کہیں قرآن و حدیث میں یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ فرشتوں سے مدد مانگو تو غیر منصوص اعانت کے متعلق کب اجازت دی جا سکتی ہے کہ فلاں فلاں بزرگ سے مدد مانگو؟

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ: غیر اللہ سے مدد مانگنا یا اسے مدد کے لئے پکارنا کوئی شرک نہیں۔ شرک تو صرف عبادت میں شریک کرنے کو کہتے ہیں۔ اور مدد تو ہم دن رات انسانوں سے مانگتے رہتے ہیں۔ مثلاً اے فلاں! ذرا فلاں کام کر دے۔ ایک گلاس پانی پلا دے۔ میری جوتی ٹانک دے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ شرک نہیں۔ لہٰذا اور کسی کو بھی مدد کے لئے پکارنے میں کوئی شرک نہیں" ———

عام طور پر اس قسم کی دلیل پیش کی جاتی ہے۔ جس میں ایک بڑا مغالطہ ہے۔ مندرجۂ ذیل نکات پر غور کرنے سے یہ مغالطہ دور ہو سکتا ہے۔

(۱) عبادت اور استعانت (اعانت طلب کرنا) دونوں ایک ہی سطح پر اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ استعانت عبادت ہی کا ایک لازمی جزو یا ضروری تقاضا ہے۔ اس لئے حصر کے ساتھ جہاں ایاک نعبد ہے وہیں ایاک نستعین بھی ہے۔ گویا نستعین تفسیر ہے نعبد کی۔ استعانت کے لئے جب پکارا جائے تو اسے دعا کہتے ہیں۔ اور یہ بھی عبادت ہی کی طرح اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ سیدنا ابراہیم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ واعتزلکم وما تدعون من دون اللہ . . . ۱۹/۴۸ اے قوم میں تمہیں بھی چھوڑتا ہوں اور ان ماسوی اللہ کو بھی جنہیں تم پکارتے ہو۔ اس سے اگلی آیت میں ہے: فلما اعتزلھم وما یعبدون من دون اللہ . . . ۱۹/۴۹ جب ابراہیمؑ نے

ان کو بھی چھوڑ دیا۔ اور ان ماسوی اللہ کو بھی جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔ . . . آپ نے غور فرمایا؟ دعا کی تفسیر خود قرآن نے عبادت سے کر دی ہے کہ اگر کسی کو تم مدد کے لئے پکارتے ہو تو تم اس کی عبادت کرتے ہو۔ جو مدعو ہے وہی معبود ہے اور جس کی عبادت کی جائے گی اسی سے دعا بھی کی جائے گی۔ یعنی اسی کو مدد کے لئے پکارا جائے گا۔ معبود صرف وہی نہیں جسے سجدہ کر لیا جائے۔ بت سے مدد مانگی جائے یا اسے سجدہ کیا جائے دونوں یکساں شرک ہیں۔ پس جب دعا (استعانت) اور عبادت ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں تو اس کا رشتہ جس غیر اللہ سے جوڑا جائے گا وہ شرک ہی ہوگا۔ عبادت خواہ کسی بُت کی کی جائے یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، خدا کے نزدیک دونوں یکساں شرک ہیں۔ اور اس میں ذرہ برابر بھی کسی لچک کی گنجائش نہیں۔

دوسرا ضروری اور قابل غور نکتہ یہ ہے کہ استعانت (ون وے ٹریفک کی طرح) یک طرفہ ہوتی ہے۔ اور جو دو طرفہ ہو اسے استعانت نہیں کہتے بلکہ تعاون کہتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ غیر اللہ سے استعانت قطعی حرام ہے۔ اور تعاون فرض ہے جو ہوتا ہی ہے غیر اللہ سے۔ شرط صرف یہ ہے کہ نیکی اور تقوے کی باتوں میں ہو۔ ارشاد خداوندی ہے کہ:۔ تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (نیکی اور تقوے میں تعاون کرو۔ اور اثم و عدوان میں تعاون نہ کرو)

اب ان دونوں کا فرق بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ تعاون کے معنی ہیں ایک دوسرے کی باہمی مدد کرنا۔ یعنی زید ایک کام میں خالد کی مدد کرتا ہے۔ اور اسی کام میں یا دوسرے کام میں خالد زید کی اعانت کرتا ہے۔ اسے کہتے ہیں تعاون۔ اس وقت امداد کے لئے پکارنے والا یا اچھی طرح سمجھتا ہے کہ آج یہ میری مدد کا محتاج ہے اور کل میں اس کی امداد کا ضرورت مند ہوں گا۔ سارے بنی آدم اسی طرح ایک دوسرے کے محتاج ہیں آپ کے گھر کا کُنّاس (بہتر) آپ کی تنخواہ کا ضرورت مند ہے۔ اور آپ اس کی صفائی کے محتاج ہیں۔ اور ایک دوسرے کی محتاجی سے دونوں اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ ہے تعاون۔ لیکن استعانت اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ جب ہم خدا سے استعانت کرتے تو یہ ایمان و یقین ہوتا ہے۔ کہ ہم تو اس کے قدم قدم پر محتاج ہیں۔ لیکن وہ کسی جہت سے بھی ہمارا محتاج نہیں۔ اگر آپ کسی بزرگ یا جن یا فرشتے کو مدد کے لئے پکارتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی یقین کرتے ہیں کہ یہ بزرگ بھی ہمیں مدد کے لئے بلائے گا تو بے تامل پکار لیجئے۔ کیونکہ یہ تعاون ہے۔ اور اگر یہ سمجھتے ہوں کہ ہم تو اس کی مدد کے محتاج ہیں۔ اور

بے ہماری مدد کا ضرورت مند نہیں۔ تو یہ استعانت ہے۔ بہ لغوائے ایاک نعبد وایاک نستعین صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ اور غیراللہ سے استعانت شرک ہے۔ اب یہ پکارنے والے کا کام ہے کہ وہ یہ دیکھ لے کہ وہ جسے مدد کے لئے پکار رہا ہے اسے کیا مقام دے رہا ہے۔ آیا اپنی طرح اسے محتاج سمجھ رہا ہے یا خود کو محتاج اور اسے بے نیاز سمجھ رہا ہے۔

ایک عذر یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ "صاحب اگر آپ کسی بادشاہ سے ملنا چاہیں تو براہ راست نہیں مل سکتے اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے زینہ بزینہ وسیلے اختیار کرنے پڑیں گے"۔ اسی طرح خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بزرگان دین کا توسل اختیار کرنا پڑے گا"۔ مگر یہ معذرت بھی ایک مغالطہ ہے۔ اگر بادشاہ خود آپ کے پاس کھڑا ہو اور کہے کہ مانگو جو کچھ مانگنا چاہتے ہو"۔ تو کیا آپ اس کے دفتر والوں کو، سیکرٹری کو اور وزیر کو ڈھونڈتے پھریں گے۔ کہ وہ آئیں تو ان کی وساطت سے درخواست پیش کی جائے؟ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہاں تک رسائی حاصل کر کے درخواست پیش کرنے کے لئے کسی ڈیپارٹمنٹل آفیسر کے وسیلے کی ضرورت ہے یا براہ راست بھی اس سے التجا کی جا سکتی ہے، واقعہ یہ ہے وہ ہم سے دور کہیں الگ تھلگ تخت نشین ہو کر نہیں بیٹھا ہے۔ وہ ہم سے قریب ہے بہت قریب۔ واذا سالک عبادی عنی فانی قریب (اے رسول جب لوگ تم سے میرے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو میں قریب ہی ہوتا ہوں) وہ صرف قریب ہی نہیں بلکہ اتنا قریب ہے کہ رگِ جان اتنی قریب نہیں، ہم خود اپنی ذات سے اتنے قریب نہیں۔ جتنا وہ قریب ہے نحن اقرب الیہ من حبل الورید (ہم رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں) اور وہ محض ذہنی، فرضی یا شاعرانہ حیثیت سے قریب نہیں کہ ہم سے بے تعلق اور بے توجہ ہو۔ بلکہ اس کا ارشاد ہے کہ:۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں) وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ:۔ ادعونی استجب لکم (تم مجھے پکارو میں تمہیں جواب دوں گا) اس نے یہ نہیں کہا کہ تم مجھ سے ڈائرکٹ نہ مانگو، یا جب مجھ کو پکارو تو فلاں فلاں نیک بندوں کے وسیلے سے پکارو، ورنہ میرے پاس نہ تمہاری درخواست پہنچ سکے گی اور نہ منظور ہو سکے گی"۔ اب خود سوچئے کہ اس سے زیادہ بدنصیب کون ہو سکتا ہے۔ جس کے سامنے بادشاہ کھڑا کہہ رہا ہو کہ "اپنی درخواست پیش کرو" اور وہ اپنی درخواست کو پیش کرنے کے لئے ادھر ادھر کے واسطوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ خیر اگر صرف

اس حد تک معاملہ رہتا کہ درخواست کسی کے واسطے سے بھیج دی جائے تو پھر بھی غنیمت تھا۔ یہاں تو یہ ہوا کہ درخواست میں مخاطب ہی واسطوں اور وسیلوں کو کیا جاتا ہے۔ اور سمجھا یہ جاتا ہے کہ ان وسیلوں کو خدا کی طرف سے ڈیپارٹمنٹل اختیارات حاصل ہیں کہ وہ چاہیں تو از خود ہی اس درخواست کو منظور کریں، یا رد کر دیں یا اوپر منظوری کے لئے سفارش کر کے بھیج دیں۔

توسل کی حیثیت صرف اسی قدر ہے کہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی کو واسطہ بنا لیا جائے۔ اور وہ واسطہ صحیح و درست ہو۔ خود ساختہ فرضی اور ناشدنیہ نہ ہو۔ لکھنے پڑھنے کے لئے ایک استاد کو واسطہ بنایا جاتا ہے۔ متعلم خواہ کتنا ہی بلند ہو جائے اور اپنے استاد سے بھی آگے بڑھ جائے۔ لیکن استاد بہر حال محسن ہو گا۔ اور شاگرد احسان مند ہو گا۔ تاہم استاد صرف ذریعہ و واسطہ ہو گا، مقصود نہ ہو گا، مقصود ہے پڑھنا لکھنا، اسی طرح ایک پیغمبر ہو یا کوئی صالح انسان، وہ بہر حال ایک واسطہ و ذریعہ ہے ایک تعلیم کا۔ وہ مقصود نہیں۔ مقصود صرف اللہ ہے۔ اور ان معلمین کی تعلیم ہی یہ ہے کہ مستحق عبادت معبود اور لائق دعا و استعانت مدعو و مستعان صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ پس اللہ کو چھوڑ کر یا اللہ کے ساتھ خود ان کو مدعو و مستعان بنانا تو خود انہی کی تعلیم کے خلاف ہے اگر جوشِ عقیدت میں خود انہی کو مستعان و مدعو بنا لیا جائے تو یہ ایک ایسی عقیدت ہو گی جو خود انہی کی تعلیم کے خلاف ہونے کی وجہ سے سراسر ضلالت ہو گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے طبیب ایک کاغذ پہ نسخہ لکھ دے۔ اور مریض جوشِ اعتقاد میں آکر اسی کاغذ کو گھول کر پی جائے۔

یہ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ مدعو و مستعان بنانا اور معبود بنانا ایک حقیقت کے دو رخ ہیں۔ اب دیکھیے کہ اس بارے میں خود انبیاء کی تعلیم کیا ہے۔ قرآن بہت واضح لفظوں میں اس کا اعلان فرماتا ہے کہ:۔ ماکان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتب وبما کنتم تدرسون ہ ولا یامرکم ان تتخذوا الملئکۃ والنبیین اربابا ... (۳/ ۷۹، ۸۰) کسی بشر کے لئے یہ جائز نہیں کہ اللہ اسے کتاب، قوت فیصلہ اور نبوت عطا کرے اور لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے مقابلے میں میرے عبد (بندے) بن جاؤ بلکہ (اس کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ) تم ربانی (رب کے بندے) بنو (بوجہ اس کے کہ تم کتاب کی تعلیم بھی دیتے ہو۔ اور پڑھتے بھی ہو۔ اور وہ یہ حکم بھی نہیں دے سکتا کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رب بنا لو ..... مطلب یہ ہے کہ تم خود عبد تو بنو۔ لیکن تمہارا معبود کوئی نبی یا فرشتہ نہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ہو۔ پس جب کوئی نبی و فرشتہ تک معبود اور مدعو نہیں بن سکتا تو دوسری روحیں کب مدعو و معبود بننے کے لائق ہو سکتی ہیں؟

یہاں تک تو استعانت بغیر اللہ کا ذکر تھا لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کے سوا کوئی قسم شرک موجود نہیں یہ تو صرف ایک قسم ہے۔ ورنہ شرک کی اور بہت سی قسمیں ہیں، شرک کئی راستوں سے آتا ہے اور قرآن پاک نے ان سب کی نشاندہی کر دی ہے۔ دو ایک کا یہاں ذکر کر دینا ضروری ہے۔

**فرقہ بندی** شرک کی دوسری قسم فرقہ بندی ہے۔ قرآن نے اس کو یوں بیان کیا ہے)۔ واقیموا الصلوٰۃ ولا تکونوا من المشرکین ہ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا۔ . . یعنے اقامت صلوٰۃ کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو، یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے دین میں تفریق پیدا کر دی۔ اور گروہ گروہ ہو گئے —— یہ بڑا نازک مقام ہے۔ اس لئے فرقہ بندی کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ یہاں فوراً ذہن میں ایک سوال پیدا ہو گا کہ کیا یہ تمام حضرات جو اپنے آپ کو سنی، شیعہ، حنفی، اہل حدیث وغیرہ کہتے ہیں یا کسی اور فرقے کی طرف منسوب کرتے ہیں، مشرک ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نبوت کے چند سال کے بعد سے لے کر آج تک کوئی موحد گزرا ہی نہیں۔ اور سب کے سب نعوذ باللہ مشرک ہی ہیں۔ ہم اتنی بڑی جسارت تو نہیں کر سکتے۔ اور واقعہ بھی یہ نہیں۔ بات صرف اتنی ہے۔ جتنے بھی مسلمان فرقے ہیں وہ جداگانہ مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر مکتب خیال دین (اسلام) ہی کی مختلف تعبیریں ہیں۔ کسی ایک سے وابستگی کوئی شرک نہیں۔ لیکن اگر وابستگی کا انداز ایسا ہو کہ نفس دین کی وابستگی پر اس فرقے یا اس مکتب فکر کی وابستگی غالب آجائے تو اس کے مشرک ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں دین کی وابستگی کمزور اور فرقی عصبیت قوی ہو جائے گی۔ اور اس کا ظہور یوں ہو گا کہ فلاں فرقے (جس سے ہماری وابستگی ہے) کی ہر بات بے چوں و چرا ماننی ضروری ہے۔ اور فلاں فرقے کی (جس سے ہم وابستہ نہیں) کوئی بات ماننے کے قابل نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آخری سند اللہ تعالےٰ نہ رہے گا۔ بلکہ وہ فرقہ یا اس کا سربراہ (امام) آخری سند بن جائے گا۔ اور اس کے شرک ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ فرقے کی رعایت (یا دوسرے فرقے کی عداوت) کا جذبہ جب حق سے قطع نظر کرنے پر مجبور کر دے تو وہ شرک ہی ہو گا۔ کیونکہ حق صرف وہ شے ہے جس کی سند خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہو۔ اگر خود خدا کسی کی بات ماننے کو کہے تو اس کی بات ماننا بھی عین حق ہی ہے۔ کسی فرقے کے امام کی ہر بات بے چون و چرا مان لینے کے لئے کوئی آسمانی سند موجود نہیں ان ائمہ کو یا ان کے فقہی مسائل کو مان لینا صرف اسی حد تک درست ہے جس حد تک یہ اعتماد ہو کہ ان کا استنباط اور ان کی تفسیر تعبیر حق سے زیادہ قریب ہے۔ اگر کسی معاملے میں دلائل و براہین کمزور یا بے وزن نظر آئیں تو اس کو محض اس لئے مان لینا صحیح

نہیں کہ یہ مسئلہ ہمارے امام نے یوں ہی بیان کیا ہے۔ کسی امام پر عمومی اعتماد صرف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس راہ کا مخصوص ماہر (اسپیشلسٹ) ہے اور ہماری نظر وہاں تک ہماری بے علمی کی وجہ سے نہیں پہنچ سکی ہے۔ اس قسم کے اعتماد میں چنداں مضائقہ نہیں کم فرصتی اور علمی بے بضاعتی کی وجہ سے ایک کثیر طبقہ کو ایسا کرنا پڑتا ہے۔ اور طبقۂ عوام کے لئے یہ ایک مجبورانہ طرزِ تقلید ہے لیکن جب دلائل سے اس کی غلطی واضح ہو جائے تو علم و اطمینان ہو چکنے کے بعد بھی (من بعد ما جاءھم العلم) اور (من بعد ما جاءھم البینٰت) اس سے چپٹے رہنے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ فرقی عصبیت اور فرقی جانبداری و پاسداری کا جذبہ حق پرستی پر غالب آگیا ہے۔ اور یہی شرک ہے۔ ترکِ حق خواہ مذہبی مسائل میں ہو یا قبیلوی عصبیت میں ہو۔ سیاسی معاملات میں ہو یا باہمی نزاعات میں ہو سب ہی شرک کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ درجات مختلف ہوں۔ اسی قسم کی فرقی عصبیت کو قرآن نے حمیتہ الجاھلیۃ (کافرانہ پاسداری) کہا ہے۔

فرقے بندی کو ایک اور نقطۂ نظر سے بھی دیکھئے۔ دراصل وحدت ربانی کا لازمی تقاضا ہے۔ وحدتِ انسانی۔ قرآن نے اس حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے کہ: ما کان الناس الا امۃ واحدۃ فاختلفوا ... ۱۰/۱۹ تمام انسان ایک ہی امت ہیں۔ مگر لوگوں نے اختلافات پیدا کر لئے۔ اختلاف خیال بربنائے اخلاص ہو تو یہ گناہ نہیں۔ کافرانہ و مشرکانہ اختلاف وہ ہے جس کا ذکر ۲/۲۱۳ میں ہے اسی وحدت انسانی کے مضمون کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ:۔ وما اختلف فیہ الا الذین اوتوہ من بعد ما جاءھم البینٰت بغیا بینھم۔ اس میں انہی لوگوں نے جو صاحب کتاب تھے۔ بینات آچکنے کے بعد باہمی عداوت کی وجہ سے اختلاف کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اخلاصِ اختلاف کا اس وقت پتہ چل جاتا ہے جب دلائل آجائیں۔ اگر اختلاف میں اخلاص ہوگا تو وہ محض اس لئے اس پر کبھی اڑا نہ رہے گا کہ یہ ہماری پارٹی یا فرقے کے مطابق نہیں۔ جس میں خاندانی عصبیت، فرقی حمایت یا قبیلوی حمیت ہوگی۔ وہ کسی دلیل کو تسلیم نہیں کرے گا۔ اور اگر اخلاص ہوگا تو اپنے فرقی جذبے پر آسمانی و عقلی دلیل کو ترجیح دے گا۔ کیونکہ وحدتِ انسانی اتنی اعلیٰ قدر ہے کہ اسے ہر شئے پر مقدم رکھے گا۔ اس لئے کہ وحدت ربانی کا لازمی تقاضا ہے، وحدتِ انسانی پس جس طرح الوہیت کے ٹکڑے کرنا توحید کی نقیض یعنی شرک ہے اسی طرح فرقے بندی سے انسانی وحدت کے ٹکڑے کرنا بھی شرک ہے۔ وہ وحدت ربانی کو پارہ پارہ کرتا ہے اور یہ وحدت انسانی کے ٹکڑے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تفریق دین کرنے اور گروہ بندیاں پیدا کرنے کو شرک قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے رسولؐ کو مشرکین سے کیا تعلق ہو سکتا ہے جبھی تو دوسری جگہ یوں فرمایا گیا کہ:۔ ان الذین فرقوا

دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیء ـــ جن لوگوں نے دینی تفرقہ پیدا کی اور گروہوں میں بٹ گئے اسے رسول! تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ گویا فرقہ بندی شرک بھی ہے۔ اور کفر بھی۔

ذرا ایک اور زاویۂ نگاہ سے بھی فرقہ بندی کو ملاحظہ فرمائیے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون سے غصے میں بازپرس فرمائی کہ:۔ ما منعک اذ رایتھم ضلوا الا تتبعن ۔ ۔ ۔ ـــ جب تم نے ان لوگوں کو گوسالہ پرستی میں گمراہ ہوتے دیکھا تو سخت گیری میں میری پیروی کرنے سے تمہیں کس چیز نے روکا؟ اگلی آیت میں اس سوال کا جو جواب سیدنا ہارون علیہ السلام نے دیا ہے وہ فرقہ بندوں کے لئے بصیرت وعبرت ہونا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا:۔ انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے یہ خطرہ تھا کہ کہیں آپ (موسیٰ) یہ الزام نہ دیں کہ تم (ہارونؑ) نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ پیدا کر دی ـــ اللہ اللہ ایک پیغمبر (ہارون) دوسرے پیغمبر (موسیٰ) کی واپسی از طور تک کے لئے گوسالہ پرستی جیسے بدترین شرک کو عارضی طور پر گوارا کر لیتا ہے۔ لیکن یہ گوارا نہیں کرتا کہ قوم میں تفرقہ پیدا ہو۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ملت کا باطل پر اجماع جتنا بُرا ہے اس سے زیادہ بُرا اپنے دین کے نام پر تفرقہ پیدا کرنا۔ اول الذکر میں کم از کم دنیا تو مل جائے گی۔ لیکن ثانی الذکر کا نتیجہ ہوگا خسر الدنیا والآخرۃ۔

اس مضمون قرآنی کے عین مطابق ہے یہ ارشاد نبوی جس میں سیدہ عائشہ کو مخاطب کرتے ہوئے حضور نے فرمایا:۔ یا عائشۃ! ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا ھم اصحاب البدع والاھواء لیس لھم توبۃ انا منھم بری وھم منی برآء۔ (رواہ الطبرانی فی الصغیر عن عمرؓ بن الخطاب) یعنی اے عائشہ ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا (جن لوگوں نے دینی تفرقہ پیدا کی اور گروہوں میں بٹ گئے) وہ لوگ ہیں جو اہل بدعت ہیں۔ اور اپنی خواہشوں کے بندے۔ ان کی توبہ بھی مقبول نہیں۔ میں ان سے اور وہ مجھ سے بَری ہیں ـــ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

## اتخاذ رب

شرک کی ایک تیسری قسم بھی ہے۔ اور وہ بہت عام ہے وہ ہے اتخاذ رب یعنی غیر اللہ کو رب بنا لینا۔ اس کا مطلب سمجھنے کے لئے صرف ایک حدیث پیش کر دینا کافی ہے۔ عدی بن حاتم نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت تلاوت فرماتے سنا کہ:۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ

---

سلہ گلستان حدیث میں فرقہ بندی پر ایک مضمون ہے وہ اس موقع پر دیکھ لینا چاہیئے۔ اس میں ان آیات واحادیث پر بحث کی گئی ہے۔

(ان لوگوں نے اپنے علماء مشائخ کو رب بنالیا ہے) اس کے بعد حضورؐ نے خود اس کی تشریح یوں فرمائی ہے:۔ انھم لم یکونوا یعبدونھم ولکنھم اذا کانوا احلوا لھم شیئاً استحلوہ واذا حرموا علیھم شیئاً حرموہ (رواہ الترمذی عن عدی بن حاتم) یعنی وہ اپنے علماء مشائخ کی پوجا نہیں کرتے تھے بلکہ جب وہ کوئی شے حلال کر دیتے تو یہ اسے حلال کر لیتے۔ اور جب وہ کوئی چیز حرام کر دیتے تو یہ بھی حرام کر لیتے ——— مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے کا اختیار بجز اللہ تعالیٰ کے کسی شخص کو نہیں اختیار صرف اتنا بھر ہے کہ انفرادی یا اجتماعی مصالح کی خاطر کسی چیز کو حلال یا حرام کیا جا سکتا ہے۔ یہ تحریم و تحلیل مختصر مدت کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور طویل وقت کے لئے بھی لیکن تحلیل و تحریم ازلی ابدی یا مستقل نہ ہوگی۔ عارضی ہوگی۔ جسے موجودہ اصطلاح میں آرڈی ننس کہتے ہیں۔ ایک طبیب مریض سے کہتا ہے کہ تم اتنے عرصے تک یا عمر بھر گوشت نہ کھاؤ یا اپنی جان بچانے کے لئے لحم خنزیر کھا لو تو یہ انفرادی تحریم و تحلیل عارضی ہوگی۔ اسی طرح اگر ایک اسلامی حکومت یہ اعلان کر دے کہ منگل اور بدھ کے دن ذبیحہ نہ ہو تو یہ ذبیحہ اصالتاً حلال ہی رہے گا اور یہ اجتماعی تحریم عارضی ہوگی۔ جب حالات و مصالح بدل جائینگے تو انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی تحلیل و تحریم اپنی مستقل اصلیت پر لوٹ آئے گی۔ اور آرڈی ننس واپس لے لیا جائے گا۔

تحریم و تحلیل کی ایک قسم اور بھی ہے۔ جس کا اختیار ان کو حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ شرعی ہدایات و اصول کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے کسی چیز کے جائز یا ناجائز ہونے کا حکم لگائے۔ مثلاً سانپ کے متعلق قرآن خاموش ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ حرام ہے مگر امام مالک۔ ابن ابی لیلیٰ اور اوزاعی اسے حلال کہتے ہیں۔ جس کی تحقیق پر ہمارا اطمینان ہو اسے مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ہمارا عمل تو اس کے مطابق ہوگا۔ لیکن ہمیں اس کا حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے کے متعلق یہ دعویٰ کریں کہ اس نے حرام کو حلال یا حلال کو حرام کر لیا ہے۔ کیونکہ یہ تحریم و تحلیل محض ایک قیاس یا اجتہاد ہے۔ جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اور صحیح بھی لہٰذا خدائی تحلیل و تحریم کی طرح اس پر ایمان نہیں لایا جا سکتا۔ خدا کے سوا کسی اور کو اس کا اختیار ہی نہیں آنحضرتؐ نے اپنے اوپر شہد حرام کر لیا تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوال ہوا کہ: لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک؟ اے رسول! تم اس شے کو کیوں حرام کرتے ہو جسے خدا نے تمہارے لئے حلال کیا ہے۔ تم اپنی بیویوں کی رضا چاہتے ہو ——— ذرا سوچیئے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کو اپنی طرف سے کسی شے کو حلال یا حرام کرنے کا اختیار نہیں تو دوسرے حضرات کو کہاں تک اس کا اختیار ہو سکتا ہے۔ بہرحال خود مذکورہ بالا فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی واضح ہے کہ کسی کو محلل اور محرم ماننا اسے رب بنانے کے مترادف ہے۔ اور ظاہر ہے کہ

اس کے شرک ہونے میں کوئی کلام نہیں [۱]۔

**اتخاذ آلہ**

شرک کی ایک اور چوتھی قسم بھی ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ: ارأیت من اتخذ الٰھہ ھوٰہ ؟ کیا تم نے اسے بھی دیکھا ہے۔ جس نے اپنی خواہشوں کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے ؟ ——— جس طرح رب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی طرح آلہ بھی صرف وہی ہے۔ لہٰذا جس طرح غیر اللہ کو رب بنانا شرک ہے اسی طرح غیر اللہ کو آلہ بنانا بھی شرک ہے۔ اپنی خواہشوں پر چلنے کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی کوئی خواہش پوری نہ کی جائے۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی جس خواہش کی تکمیل کے لئے خدا کی طرف سے سندِ جواز موجود ہو۔ اس میں کسی قسم کا کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن جہاں خدا کی طرف سے سندِ جواز موجود نہ ہو اس پر چلنا بلاشبہ شرک فی الالوہیت ہے۔ کیونکہ آلہ وہی ہوتا ہے جس کے حکم پر چلا جائے۔ پس اگر الٰہی حکم کے مقابلے میں کوئی شخص اپنا حکم چلائے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ خدا کے مقابلے اپنے آپ کو آلہ بناتا ہے۔ اور یہ صریحاً شرک ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص قرآن کا مطالعہ بھی اس لئے کرتا ہے کہ اسے اپنی خواہش کے مطابق چلائے تو وہ شرک ہی ہوگا۔ مطالعہ قرآن کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس میں خدا کی خواہش و مرضی تلاش کی جائے نہ کہ اپنی خواہش۔ اجتہادی غلطی سو بار ہو جائے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ تلاش و فہم کی اور اجتہاد کی غلطی ہوگی۔ لیکن اگر اپنی خواہش کو تلاش کرنے کے لئے مطالعۂ قرآن ہو تو صحیح نتیجے پر پہنچنے کے بعد بھی وہ شرک ہوگا۔ اس لئے کہ مقصد خدا کی خواہش پر چلنا نہیں۔ بلکہ اپنی خواہش کی پیروی کرنا ہے۔ یہ مقام بڑا ہی نازک ہے۔ اور یہاں قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہیئے۔

اس ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر انسان سے کوئی دانستہ گناہ بھی ہو تو ظاہر ہے کہ اپنی خواہش ہی پر چلنا ہوگا اور خدا کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ اس میں شائبۂ شرک تو موجود ہے۔ لیکن یہ انسانی سرشت کی کمزوری ہے اس لئے رحمتِ خداوندی نے ایسے مواقع پر تلافی اور عفو کی بڑی گنجائشیں رکھی ہیں۔ گناہگار میں اگر ندامت ہوتی ہے اور وہ تائب ہو کر تلافی کرتا ہے تو رحمتِ الٰہی اسے آغوشِ عفو میں لے لے گی۔ انسان اپنی سرشت میں کمزور ہے۔ اس لئے اگر وہ بار بار بھی ایسی غلطیاں کرے تو ہر بار اس کی ندامت و توبہ و تلافی بارگاہِ الٰہی میں شفیع بن جائے گی۔ لیکن اگر وہ اس پر اڑا رہے اور احساسِ ندامت و توبہ و تلافی غائب ہو جائے یا وہ اسے گناہ ہی نہ تصور کرے تو ظاہر ہے کہ وہ مشرک ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنی خواہش کو خدا کی خواہش

---

[۱] اس موضوع کی مزید تفصیلات کے لئے اگست ۵۸ء کا ثقافت ضرور دیکھئے۔

کے مقابلے میں رکھتا ہے۔ یہی ہے اپنی خواہشوں کو اِلٰہ بنانا۔ اعاذنا اللہ منہ

## مثلہ معہ

شرک کی ایک اور پانچویں قسم بھی ہے اور وہ کچھ کم عام نہیں۔ یہ آپ معلوم کر چکے ہیں کہ محض غیر اللہ کو سجدہ اس کی پوجا کرنا ہی شرک نہیں بلکہ غیر اللہ کو مستعان سمجھنا۔ اور اسے مدد کے لئے پکارنا بھی شرک ہے نذر نیاز بھی شرک ہے۔ غیر اللہ کو محلّل و محرم ماننا بھی شرک ہے۔ اور اپنی خواہش کی پیروی (بمقابلہ حکم الٰہی) کرنا بھی شرک ہے۔ یوں ہی سمجھئے کہ جس طرح خدا کی کوئی مخصوص صفت کسی غیر اللہ پر چپکانا شرک ہے اسی طرح کسی بات میں کسی کو بھی اس کے برابر کرنا شرک صریح ہے۔ کائنات کی سب سے بڑی ہستی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن حضور کی کسی چیز کو بھی خدا کی کسی شے کے برابر کرنا شرک ہے۔ ولم یکن لہ کفواً احد کے صرف یہ معنی نہیں کہ اس کا کوئی رشتے دار نہیں بلکہ اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ کوئی ہستی کسی بات میں بھی اللہ کی ہمسر، ہم رتبہ، برابر، مساوی، مثل نظیر اور مد مقابل نہیں، نہ ذات میں نہ کسی صفت میں۔ لہٰذا جو فرق اللہ اور اس کے رسول میں ہے وہی اللہ کے کلام اور رسول کے کلام میں ہے۔ اللہ معبود ہے۔ اور رسول عبد ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور حدیث رسول کا کلام ہے۔ اگر کسی حدیث کے متعلق صراحتاً یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ حدیث قدسی ہے یا یہ وحی خفی (غیر متلو) ہے جب بھی وہ واجب الاطاعت ہونے کے باوجود مثل القرآن نہیں ہو سکتی کسی حکم کا واجب الاطاعت ہونا اور چیز ہے اور اس کا مثل قرآن ہونا اور شے ہے۔ اطاعت تو ایسے حکم رسول کی بھی ضروری ہے جس کے متعلق صراحتاً معلوم ہو جائے کہ رسول خدا کی طرف سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے کہہ رہا ہے۔ اطاعت تو اولی الامر کے ایسے حکم کی بھی ضروری ہے جس کے متعلق یہ علم ہو کہ خدا کے حکم کے خلاف نہیں۔ تاہم ایسے احکام کو واجب الاطاعت جاننے کے باوجود مثل القرآن نہیں کہا جا سکتا۔ ایک معمولی سپاہی کی اطاعت بھی صدر مملکت کی اطاعت ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام مملکت کے ہر چھوٹے بڑے صاحب امر کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے۔ اور عین مطابق حکم قرآنی ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ ہر امیر مملکت کا فرمان عین کلام الٰہی یا مثل قرآنی ہے۔ کسی عبد کا کلام نہ معبود کا کلام بن سکتا ہے اور نہ معبود کے کلام کی مثل ہو سکتا ہے۔ جس طرح خدا کی کوئی نظیر و مثیل نہیں اسی طرح اس کے کلام کی بھی کوئی مثال و نظیر نہیں

اوّلاً تو یہ روایت (کہ اوتیت مثلہ معہ = مجھے قرآن ہی جیسی ایک چیز اور بھی دی گئی ہے) ہی سنداً اور متناً محل نظر ہے اور اگر اسے درست مان بھی لیا جائے تو یہ مثلیت[۱] "واجب الاطاعت ہونے میں ہے۔ وہ بھی اس وقت جبکہ (۱) اس کا

---

[۱] یہ بحث "مقام سنت" میں دیکھ لینا مفید ہوگا جہاں اس پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

احکام سے تعلق ہو (۲) قرآن سے یا دوسری قوی حدیث سے یا عقل سے یا عصری تقاضے سے یا انفرادی و اجتماعی مصالح سے متصادم نہ ہو (۳) وہ بحیثیت امیر یا قاضی[۱] کے ہو۔ ذاتی رائے نہ ہو۔ ان تمام صورتوں میں فرمانِ رسولؐ واجب الاطاعت ہے۔ حکم قرآن کے مطابق ہے۔ اور صرف اسی حیثیت سے مثل القرآن ہے۔ یہ مثلیت شرک نہیں۔ کیونکہ یہ ایسی ہی مثلیت ہے جیسے خود رسول ہمارے مثل ہے۔ قل انما انا بشر مثلکم (کہ وہ اے رسول کہ میں تمہاری ہی طرح کا بشر ہوں ۔۔۔۔) اگر ہم یہاں من جمیع الوجوہ رسول کو اپنے جیسا انسان کہنا کفر سمجھتے ہوں تو کلام رسول کو کلام اللہ کے مثل سمجھنا بھی شرک ہی سمجھنا چاہیئے۔

تعجب یہ ہے کہ بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا بڑا بھائی اور اپنے جیسا انسان سمجھنے اور کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ لیکن جب معاملہ روایات کا آجاتا ہے تو اسے اپنے جیسا کلام بتانے کو کفر اور کلام الٰہی کے مثل بتانے کو عین توحید سمجھتے ہیں۔ میرا مسلک اس باب میں بالکل واضح ہے۔ جو فرق ہم میں اور رسول میں ہے۔ وہی ہماری بات اور رسول کی بات میں ہے۔ اسی طرح جو فرق اللہ اور اس کے رسول میں ہے وہی دونوں کے کلام میں ہے۔ رسول کو یا رسول کی احادیث کو اپنی ذات یا اپنی بات کے برابر سمجھنا کفر ہے اور خدا کی ذات یا خدا کے کلام کے برابر سمجھنا شرک ہے۔

شرک کی یہ دو چند قسمیں ہیں۔ جن کا ذکر صراحت کے ساتھ قرآن میں آیا ہے۔ اور یہ ساری قسمیں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔ شرک توحید کی نقیض ہے۔ اور توحید نہ ہو تو اسلام کہاں رہ جاتا ہے؟ ہاں یہ صحیح ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس کے ساتھ بہت سی خدا پرستانہ توحیدیں بھی موجود ہیں۔ اسی لئے ہم صراحۃً شرک کہنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس بات کے اقرار میں تامل نہ چاہیئے کہ فلاں فلاں باتیں مشرکانہ ہیں۔ یعنی یہ تقریباً ایسی ہی صورت حال ہے کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور صوم و حج بھی ہے۔ اور ساتھ ہی رشوت خواری، اسمگلنگ، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی وغیرہ بھی ہے۔ پس جو امتزاج ان متناقض اعمال میں ہے۔ تقریباً وہی توحید و شرک میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ ہمیں اس کیچڑ سے جلد نکال لے اور توحید ناب کی توفیق بخشے۔ آمین

---

[۱] اس موضوع کی تفصیلات کے لئے ثقافت جنوری و فروری ۷۱ء میں دیکھ لیجئے۔